# جی چاہتا ہے نقشِ قدم چومتے چلیں

## شیخ الہند
## مولانا محمود حسنؒ

خان یاسر

## امی، ابّی اور دادا کے نام

جن سے میں نے سیکھا کہ
عظیم شخصیات
آسمان سے نہیں اترتیں
بلکہ
زمین پر پیدا ہوتی ہیں،
زمین سے وابستہ ہوتی ہیں؛
اور یہ کہ
ہر بچہ
اگر 'چاہے'
تو 'بڑا' آدمی بن سکتا ہے...

حق و انصاف کی بے خوف حمایت کی ہے
یہ بغاوت ہے تو ہاں ہم نے بغاوت کی ہے

”اسلام صرف عبادات کا نام نہیں ہے بلکہ وہ تمام مذہبی، تمدنی، اخلاقی اور سیاسی ضرورتوں کے متعلق ایک کامل و مکمل نظام رکھتا ہے، جو لوگ زمانۂ موجودہ کی کشمکش میں حصہ لینے سے کنارہ کشی کرتے ہیں اور صرف حجروں میں بیٹھ رہنے کو اسلامی فرائض کی ادائیگی کے لیے کافی سمجھتے ہیں وہ اسلام کے پاک و صاف دامن پر ایک بدنما دھبہ لگاتے ہیں، ان کے فرائض صرف نماز روزہ میں منحصر نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی اسلام کی عزت برقرار رکھنے اور اسلامی شوکت کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری بھی ان پر عائد ہوتی ہے۔[۴]“

(محمود حسن)

# محمود حسن

**پیدائش اور بچپن:** محمود حسن 1852 میں بریلی میں پیدا ہوئے۔آپ کا گھرانہ ایک علمی گھرانہ تھا،آپ کے والد صاحب بریلی کالج میں پروفیسر تھے، بعد میں ترقی پا کر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ چھ سال کی عمر میں محمود حسن کی بسم اللہ ہوئی اور ساتویں سال میں وہ اپنے والد کے تبادلے کی وجہ سے میرٹھ آ گئے۔ میرٹھ سے ہی غدر 1857 کی شروعات ہوئی تھی؛ اس بغاوت، ناکامی اور اس کے دوررس اثرات بچپن سے ہی محمود حسن کی نفسیات کا حصہ بن گئے۔ جب آپ کی عمر 15 سال کی ہوئی تو مولانا قاسم نانوتوی و رفقاء کی تحریک پر مدرسہ دارالعلوم دیوبند کی داغ بیل ڈالی گئی۔محمود حسن اس مدرسے کے پہلے طالب علم تھے۔ دارالعلوم میں تین سال تعلیم حاصل کرکے صحاح ستہ کے درس کے لیے آپ مولانا قاسم نانوتوی کی خدمت میں میرٹھ تشریف لائے۔ سفر میں حضر میں ہر وقت مولانا کے ساتھ رہتے،مولانا قاسم نانوتوی دیوبند، نانوتہ جہاں جاتے محمود حسن بھی ان کے ساتھ ساتھ جاتے حتیٰ کہ جب مولانا نانوتوی دہلی منتقل ہوئے تو آپ بھی ان کے ساتھ دہلی چلے آئے،اس طرح 1872 میں تعلیم سے فارغ ہوئے۔ آپ نے خالص شرعی علوم کے علاوہ منطق، فلسفہ اور حساب کی تعلیم بھی حاصل کی۔ تعطیل کے دنوں میں بھی وقت برباد کرنے کے بدلے اپنے والد ماجد سے عربی ادب کی تعلیم حاصل کرتے؛ یا شکار کے مردانہ شوق کو پورا کرتے۔ تعلیم کے آخری دو سالوں میں، خالی اوقات میں آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ آپ کی ذہانت اور علمی استعداد کو دیکھتے ہوئے بڑی بڑی جماعتوں کے طلبہ مشکل سے مشکل کتابوں کے درس اور الجھنوں کو رفع کرنے کے لیے آپ کے پاس آتے تھے۔ آپ بڑی محنت سے انھیں پڑھاتے تھے۔ اس اعزازی طور پر پڑھانے میں آپ خاصی لذت محسوس کرتے، باقاعدہ تنخواہ لے کر پڑھانا طبع پر ناگوار گزرتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ شروع شروع میں جب دارالعلوم کی مدرسی کی پیشکش کی گئی تو نامنظور فرما دیا، لیکن بعد میں انتظامیہ کے

بڑھتے ہوئے اصرار اور والد صاحب کے کہنے پر دار العلوم میں باقاعدہ مدرس ہو گئے۔

**میدان علم کا شہسوار:** باقاعدہ مدرس بن کر آپ نے تندہی اور لگن کے ساتھ درس دینے کا آغاز کیا۔ شروعاتی ایک دو سال تو انھیں ابتدائی کتابیں پڑھانی پڑیں، لیکن بعد میں ان کی لیاقت کو دیکھتے ہوئے انھیں اعلیٰ جماعتوں میں مشکل مضامین پڑھانے کے لیے دیے گئے، اتنا ہی نہیں بلکہ کچھ سال تو ایسے گزرے جن میں انھوں نے سولہ تا انیس کتابیں بھی پڑھائیں۔ اوقات مدرسہ میں ایک لمحے کی فرصت نہیں تھی۔ درس کی تیاری، اس کی پیشکش، طلبہ کے سوالوں کے جوابات، مشکل مقامات کا حل وغیرہ وہ بڑی محنت اور جی لگا کر کرتے تھے۔ اس دوران عربی زبان کی ایک فنی کتاب کا ترجمہ بھی کیا۔ مارچ 1877 میں مولانا قاسم نانوتوی کی معیت میں پہلا حج کیا۔ یہاں انھوں نے مولانا نانوتوی کے استاذ شاہ عبدالغنی مجددی سے بھی سند و اجازت حاصل کی۔ واپسی پر مولانا نانوتوی کے معاون کی حیثیت سے **میلہ خدا شناسی** کے مناظرے میں شریک رہے۔ اسی طرح مولانا قاسم نانوتوی کے ہی حکم پر آپ رڑکی تشریف لے گئے جہاں آریہ سماج کے بانی دیانند سرسوتی نے ایک طوفان کھڑا کیا ہوا تھا۔ آپ نے (تین دیگر ساتھیوں کے ساتھ) رڑکی کے محلے محلے میں جلسے کیے، تقریریں کیں، دیانند سرسوتی کو مناظرے کا چیلنج دیا، اس کے کھوکھلے دلائل کے مسکت جواب دیے، لیکن سرسوتی مناظرہ تو کیا کرتے، فوجی چھاؤنی سے باہر آنے تک کی ہمت نہیں جٹا پائے۔

1880 میں مولانا نانوتوی جیسے مشفق مربی کی وفات کا آپ پر گہرا اثر ہوا۔ اس کے بعد تعلیم و تدریس ہی جیسے آپ کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ اسباق کی افراط تو پہلے ہی تھی اب تھوڑا بہت وقت تصنیفی کاموں کے لیے نکالنے لگے۔ ترجمہ قرآن، **الابواب و تراجم للبخاری، ادلۂ کاملہ، احسن القری، جہد مقل، ایضاح الادلہ** اور **تصحیح ابو داؤ دان** کی چند نمایاں تالیفی خدمات ہیں۔ دروس مدرسہ اب اوقات کی بندش کے پابند نہ رہے۔ نماز فجر سے قبل جو درس شروع ہوتا تو دن بھر جاری رہتا، بمشکل دوپہر میں تھوڑا وقت نکال کر گھر چلے جاتے۔ باوجود اس جفاکشی کے تہجد، شب بیداری، اشراق، اورادو وظائف وغیرہ کے ہمیشہ پابند رہے۔ تنخواہ کے معاملے میں شروع ہی سے محتاط تھے، انھیں تنخواہ لے کر پڑھانا پسند نہ تھا لیکن بزرگوں کے اصرار پر لیتے رہے؛ بعد میں تنخواہ کا ایک تہائی حصہ دار العلوم کو چندے میں دینے لگے، کچھ دنوں بعد تنخواہ لینا سرے سے بند کر دیا۔ 1890 میں مولانا محمود حسن

دارالعلوم کے صدر مدرس بنادیے گئے۔آپ کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین بن جانے کے بعد دارالعلوم نے خوب ترقی کی۔ طلبہ کی تعداد میں روزافزوں اضافہ ہوا۔آپ نماز فجر سے عصر تک پڑھاتے ، ہرعلم وفن کی کتاب پڑھاتے مگراخیر میں صحاح ستہ ذمے لے رکھی تھی۔مولانا محمود حسن کے درس کا انداز کسی روایتی لیکچر کانہیں بلکہ بحث ومباحثے والا انداز تھا،جس سے طلبہ کی صلاحیتیں خوب ہی پروان چڑھتی تھیں۔

**ملت کا درد:** مسند تدریس پر فائز رہنے کے باوجودقوم وملت کے حالات سے مولانا محمود نہ بےخبر رہے نہ بے پرواہ۔ دارالعلوم دیوبنداس زمانے میں ملت اسلامیہ ہند میں پھیلی ہوئی مایوسی میں امید کی ایک کرن تھا۔اس دارالعلوم دیوبند کو مرکز بنا کر مولانا محمود حسن نے ملت کو بیدار کرنے اور ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرنے کامنصوبہ بنایا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ’آزادی‘ کے لفظ سے بھی کانگریس ناآشنا تھی۔دارالعلوم کومضبوط کرنے کے لیے اوراس کے فضلاء میں مرکزیت کا احساس پیدا کرنے کے لیے انھوں نے ثمرة تربیت نامی ایک انجمن قائم کی اور دارالعلوم کے تمام فارغین کو اس کاممبر بنایا۔اسی طرح اپنے پائے کے شاگردوں کوجمع فرما کرعوامی رابطے کے لیےآپ نے انجمن جمیعة الانصار کی تشکیل کی۔ یہ سب کرتے وقت آپ کی عمر چوبیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ 1910 میں آپ نے متعددمثالی جلسوں کاانعقاد کیا، دارالعلوم کے جلسہ دستار بندی میں تیس ہزار افراد نے شرکت کی۔ 1911 میں جمیعۃ الانصار کے ایک عظیم الشان جلسے کا انعقاد مرادآباد میں ہوا۔ 1913 میں شملہ میں متعدد اجلاس ہوئے۔آپ نے پڑھانے کے لیے قریبی اضلاع میں متعدد وفود بھیجنے بھی شروع کیے۔ان سرگرمیوں نے عوام کو دینی روح سے سرشار کردیا۔ جنگ عظیم اول تک یہ سرگرمیاں جاری رہیں۔

مولانا محمود حسن چھوٹے موٹےتعمیری کاموں کے کرنے پر مطمئن ہوجانے والوں میں سے نہ تھے۔وہ مکمل اور پائیدار تبدیلی کے خواہاں تھے۔اسی لیے انھوں نے ملک کی مکمل آزادی اوراسلامی نظام کے قیام کا خواب دیکھا تھا۔مولانا کے شاگردعبیداللہ سندھی نے جب انگریزی کالجوں میں پڑھنے والے لڑکوں کواسلام کے تعلق سے غلط فہمیوں کو دور کرنے اور الحاد سے متنفر کرنے کے لیے نظارۃ المعارف القرآنیہ قائم کی تو مولانا نے فرمایا، ”**جبکہ انگریزی حکومت و اقتدار ہندوستان میں**

**قائم ھے تو جس مدت تک تم اپنی اس تعلیم سے اور اس مدرسے سے دس بیس آدمی صحیح الخیال مسلمان بناؤ گے اس مدت میں انگریز ہزاروں کو ملحد اور زندیق بنادیں گے۔''**

**اتحاد و آزادی کا صور:** دارالعلوم میں ابتدا ہی سے شمال مغربی ہندوستان یعنی پشاور، سرحد، بلوچستان، افغانستان اور دوسرے آزاد قبائل کے لڑکے پڑھتے تھے۔ آپ کی ان پر خصوصی توجہ رہتی تھی۔ یہی وہ علاقے تھے جہاں بالاکوٹ کے مجاہدین اور ان کی نسلیں آباد تھیں۔ یہ قبائل غیور، خوددار، آزاد اور نڈر تھے۔ ذرا سا اسلحہ اور رسد انھیں ایک ناقابل تسخیر قوت بنا سکتا تھا۔ اپنے شاگردوں کو ان علاقوں میں بھیج کر مولانا محمود حسن پٹھانوں کو منظم کر کے ان میں جذبۂ جہاد پیدا کرنے میں لگے تھے تاکہ اپنے آپس کی قبائلی رنجشوں اور اختلافات کو بھول کر وہ اسلامی اخوت کے جذبے سے سرشار ہوجائیں۔ سرحدی بغاوت کے بعد ملک کے اندرون میں تمام بڑے شہری مراکز میں عوامی بغاوت ہونی تھی تاکہ انگریزوں کو مکمل طور پر بے دست و پا کر دیا جائے۔ کالج اور یونیورسٹیوں سے بھی خاصی تعداد میں باغی طلبہ ہاتھ آئے تھے۔ جنگ عظیم کے دوران انگریزوں کی بہت کم تعداد ہندوستان میں رہ گئی تھی۔ شمال مغرب کے پہاڑی علاقوں میں تو یہ تعداد شروع ہی سے کم تھی؛ انگریزوں نے کبھی ان علاقوں میں پاؤں رکھنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ متعدد جنگوں میں ان آزاد قبائل کے مجاہدین نے انگریزوں کی پلٹنوں کی پلٹنیں صاف کردی تھیں۔ بعد میں جب انگریز کامیاب ہوئے بھی تو صرف دھوکے بازی سے، یعنی مجاہدین کی صفوں میں ضمیر فروش افراد کی دراندازی کے ذریعہ۔ مالی تعاون اور جدید اسلحہ کی ٹریننگ کے سلسلے میں تعاون کے لیے جرمنی سے گفتگو کی گئی۔ مولانا محمود حسن نے 1915 میں حجاز کا سفر اختیار کیا، وہاں سے ترکی جانے کا ارادہ تھا کہ عثمانی سلطنت سے اس سلسلے میں مدد مانگی جائے۔

**اسیرِ مالٹا:** جنگ عظیم کی وجہ سے عوام پر پابندیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ لیڈران کی آمدورفت پر نگرانی شروع ہوگئی تھی۔ سی آئی ڈی فعال تھی۔ مولانا محمود حسن ویسے بھی ترکوں کے خلاف سرکاری فتوے پر دستخط نہ کرنے کی وجہ سے انگریزوں کے رڈار پر تھے۔ اس سے پہلے کہ مزید خطرات کا سامنا ہو انھوں نے جلدی سے حجاز کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔

حجاز کے گورنر غالب پاشا سے متعدد ملاقاتیں رہیں۔ عثمانی سلطنت نے ہند میں اسلامی آزادی کے کاز کی حمایت کی اور اس قبیل کی تحریریں مولانا محمود حسن کو دے دیں۔ ان تحریروں کو انگریزوں اور ان کے گرگوں سے بچا کر صوبہ سرحد پہنچا دینا باغیوں کا ایک کارنامہ تھا۔ باغیوں کا کمیونیکیشن سسٹم بے مثال تھا۔ ریشمی رومال تحریک اپنے عروج پر تھی۔ سب کچھ منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا لیکن شاید اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مکہ میں شریف حسین نے بغاوت کر دی۔ عثمانی سلطنت کا حجاز سے ربط ٹوٹ گیا۔ مولانا محمود حسن نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے نتائج خراب نکلیں گے، ترکوں کے خلاف فتوے پر دستخط کرنے سے ایک بار پھر انکار کر دیا۔ بالآخر انگریزوں کی ایما پر شریف حسین نے انھیں گرفتار کر لیا۔ افغانستان میں متعدد افواہیں پھیلا کر سادہ لوح عوام کو گمراہ کیا گیا اور روح جہاد کو سرد کر دیا گیا۔ مولانا محمود حسن کو گرفتار کر کے جدہ، پھر شام کے **معقل الاسود** میں قید کر دیا گیا جہاں ان سے پوچھ تاچھ ہوئی۔ پوچھ تاچھ کے دوران ان کی مومنانہ شان نمایاں رہی۔ بالآخر آپ کو جزیرہ مالٹا میں نظر بند کر دیا گیا۔

مالٹا کا جزیرہ اپنی سرد اور برفانی ہواؤں کے لیے بدنام ہے، لیکن باوجود اپنی کبرسنی کے مولانا کے معمولات میں سردی کی وجہ سے کوئی فرق نہ آیا۔ تہجد، تلاوت، مراقبہ، اشراق اور اوراد و وظائف کا معمولاً بلکہ اس سے بھی زیادہ اہتمام رہا۔ جیل میں ایک کمسن ساتھی کو مشکوۃ شریف، ترمذی اور جلالین پڑھاتے (کہ یہ کتابیں ساتھ تھیں)۔ سبق کے بعد ترجمۂ قرآن پر نظر ثانی کرتے۔ مختلف علمی و فکری موضوعات پر ساتھیوں کے ساتھ بحث و مباحثے بھی ہوتے۔ مولانا محمود حسن کو قید میں اپنی کچھ پرواہ نہیں تھی لیکن اپنے ساتھیوں کے تئیں فکر مند رہتے تھے۔ جیل کے رفقاء میں سے ایک ساتھی حکیم نصرت کو انگریزوں نے رہا کرنا چاہا لیکن انھوں نے شیخ کے بغیر اپنی رہائی منظور نہیں کی۔ مولانا محمود حسن نے انھیں بہتیرا سمجھایا لیکن وہ کسی طرح تیار نہ ہوئے، بالآخر مالٹا میں دوران اسیری ہی انتقال فرمایا۔

1918 میں جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد جب زیادہ تر قیدی رہا کیے جا چکے تھے تب اخیر میں مولانا اور ان کے ساتھیوں کو مالٹا کی جیل سے رہا کیا گیا۔ رہائی کا منظر عجیب تھا۔ ترکی کے تمام افسران، اعلیٰ عہدیداران، اور خود شیخ الاسلام، جو وہاں اب تک قید تھے، مولانا اور ان کی ساتھیوں کی رہائی کے وقت جمع ہو گئے۔ رخصتی کے اس منظر کو دیکھ کر مالٹا کے انگریز افسران حیران رہ گئے۔

**بوڑھا شیر، جواں عزائم:** انگریزوں نے غالباً سوچا کہ اتنے سال قید کی صعوبتوں کو جھیلنے کے

بعد اپنی عمر کو پیش نظر رکھ کر مولانا گوشہ نشین ہو جائیں گے، عوام سے دور رہیں گے یا کم از کم دارالعلوم کے احاطے سے باہر نہ آئیں گے۔ لیکن بمبئی کے ساحل پر انگریزوں کے لاکھ رکاوٹیں ڈالنے کے باوجود ان کا شاندار استقبال ہوا اور وہیں سے طبیعت کی ناسازی اور سفر کی تھکاوٹ کے باوجود مولانا نے خلافت کے اجلاس میں شرکت کی۔ اس جلسے میں ان کی خدمات کے پیش نظر انھیں شیخ الھند کے خطاب سے نوازا گیا۔ انگریزوں سے ترک موالات پر آپ سے استفتا مانگا گیا، آپ نے بلا جھجک شرعی دلائل کی روشنی میں تفصیل سے ترک موالات کی تائید میں ایک فتویٰ لکھا۔ اس فتوے نے ہندوستان بھر میں ترک موالات کی ایک لہر دوڑا دی۔ انگریزوں نے مولانا پر فتویٰ واپس لینے کے لیے دباؤ ڈالا لیکن مولانا نے صاف انکار کر دیا۔ طبیعت بہت ناساز رہنے لگی تھی طبیبوں نے آرام کا مشورہ دیا لیکن شیخ الہند کو تو جیسے چین ہی نہیں تھا، انھوں نے عمر بھر انگریزوں کے خلاف ایک مسلح بغاوت کی منصوبہ بندی کی تھی؛ عمر کے اس آخری حصے میں انگریزوں کے خلاف اب عدم تشدد والی 'بغاوت' میں بھی آگے آگے رہے۔ علی گڑھ کے جلسے میں دو آدمیوں کے سہارے اسٹیج پر چلے تو گئے لیکن طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے خطبہ صدارت نہ پڑھ سکے کسی شاگرد سے پڑھوا دیا۔ دہلی کے جلسے کے لیے سفر کیا لیکن طبیعت اتنی خراب ہوگئی کہ جلسے میں شرکت تک نہیں کر پائے اور اسپتال لے جانا پڑا۔ اپنی آخری وصیت میں بھی انھوں نے امت سے خواب غفلت سے جاگنے کی اپیل کی۔ صاف صاف فرمایا کہ اسلام صرف عبادات کا دین نہیں ہے اور انگریزوں سے تعاون حرام ہے۔ آپ نے ہندو مسلم اتحاد پر بھی خصوصی زور دیا۔

30 نومبر 1920 کو علم وفن کا یہ تاجدار، محدث وقائد 'اللہ، اللہ، اللہ' کہتا ہوا اللہ سے جاملا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے اور ہمیں ان کی ہمت وحوصلے سے سبق سیکھنے کی توفیق دے۔ آمین!